بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

قریب قریب گیارہ کروڑ کی آبادی کا مسلمان ملک گزشتہ سوا سال سے جان و مال کی جس اندوہناک تباہی سے دوچار ہے اس کے حالات پڑھ کر انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ انسانی جان تو خیر بڑی قیمتی ہے کسی انسان کو تو یہ بات بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی ذی روح کو ناحق ستائے یا اس پر دستِ ظلم دراز کرے۔ مگر اس بدنصیب ملک، انڈونیشیا کا یہ حال ہو گیا ہے کہ بھائی بھائی کا دمساز بننے کے بجائے اُس کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے، اُس کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے بجائے اسے غارت اور برباد کرنے میں منہمک ہے۔ املاک کا جو اتلاف ہوا ہے اس کا تو کوئی صحیح حساب نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ اس انقلاب میں تقریباً دس لاکھ قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں اور یہ وہ جانیں ہیں جن کے بارے میں ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی موقع پر بڑی تاکید کے ساتھ یہ فرمایا تھا:

ان دماءکم واموالکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا الیٰ یوم تلقون ربکم۔	تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور اس شہر (مکہ) میں حرام ہے۔

ذہن میں بار بار یہ سوال اُبھر کر آتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ آناً فاناً نیلے آسمان سے ٹوٹ پڑنے والی بجلی کی طرح ہوا ہے یا انڈونیشیا کے سیاسی افق پر ایسے تاریک بادل آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے جو ایک خوفناک طوفان کے آنے کی خبر دے رہے تھے اور پورے گھن گرج کے ساتھ اس بات کی دہائی دے رہے تھے کہ اُن کی آستینوں سے نہایت خوفناک قسم کی بجلیاں گرنے والی ہیں۔ انڈونیشیا میں جو کچھ ہوا ہے

وہ فی الحقیقت بڑا کربناک بلکہ اذیت ناک ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کچھ دفعتاً نہیں ہوا بلکہ اصحابِ اقتدار کی بے تدبیریوں اور غلط کاریوں نے آہستہ آہستہ پوری قوم کو دھکیل کر ایک نہایت خطرناک غار کے دہانہ پر لا کھڑا کیا جہاں سے وہ لڑھک کر بربادی کے آغوش میں پہنچ گئی۔ ایک عظیم الشان قوم جس نے پورے اتحاد اور اتفاق کے ساتھ ولندیزی سامراجیت کو شکست فاش دے کر ابھی چند سال پیشتر آزادی حاصل کی تھی اچانک کسی پاگل پن کا دورہ تو نہیں پڑا کہ اُس نے اپنے فرزندوں اور جاں نثاروں کو ہی کھانا شروع کر دیا ہو۔ وہ اگر فی الواقع اس وقت دیوانوں کی سی حرکات کر رہی ہے اور اُس پر واقعی دیوانگی کا عالم طاری ہے تو یہ سب کچھ یونہی کسی وقتی ترنگ میں نہیں ہو گیا بلکہ یہ ایک طویل کرب اور اذیت کا نتیجہ ہے جس نے اُس کے ذہن کو مفلوج کر کے اُسے درندوں کی سی روش اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔

یہ ذہنی کرب و اضطراب جس نے انڈونیشی قوم کے ذہنی توازن کو بگاڑ کر اُسے خود اپنی بربادی پر آمادہ کیا ہے، صرف اسی قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ٹیسیں آج پوری دنیائے اسلام میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی ایسا خطہ نہیں ہے جس میں یہی اذیت ناک صورتِ حال موجود نہ ہو۔ کہیں یہ واقعتاً لوگوں کو دیوانہ بنا کر انہیں ایک نہایت خطرناک روش پر ڈال چکی ہے، اور کہیں یہ زہر ذہنوں کے اندر آہستہ آہستہ سرایت کر کے انہیں مفلوج کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ دوسرے مسلمان ممالک بھی اس مصیبت سے دوچار ہوں۔ لیکن دنیائے اسلام کے حالات جس تشویشناک رُخ پر جا رہے ہیں۔ انہیں دیکھنے سے یہ چیز کوئی انہونی اور غیر متوقع نظر نہیں آتی۔ اسی لیے ضرورت ہے کہ ہم انڈونیشیا کے حالات کو سمجھیں اور ان سے سبق لیں۔

مسلمان عیسائیوں کے بعد تعداد کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی قوم ہیں۔ اس کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے پر ان کا قبضہ ہے۔ پھر یورپ کے صنعتی انقلاب سے پہلے یہ قوم اقوامِ عالم میں ایک

ممتاز حیثیت کی مالک رہی ہے۔ اُس کی یہ برتری جو زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ سارے شعبوں میں تھی، پورے ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ اس قوم کا اپنا ایک مخصوص نظریۂ حیات ہے۔ اس کا اپنا ایک متعین اور واضح اُسلوب زندگی ہے۔ اس کی اپنی کچھ مخصوص روایات ہیں۔ اس کا اپنا ایک درخشاں ماضی ہے۔ اس قوم نے نہ صرف ایک لمبے عرصے تک خوب و ناخوب کے اپنے معیاروں کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ رکھا بلکہ پوری انسانیت کو اُن سے متاثر کیا اور نہ صرف اس کے فکر و احساس کی صورت گری کی، بلکہ اُسے سیاست، معیشت، معاشرت اور مذہب کی نئی قدروں سے نوازا۔ ہمیں اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ اس قوم کی ان قدروں کی نوعیت کیا تھی اور انہوں نے انسانیت پر کیا اثرات مرتب کیے، بلکہ اس جگہ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ قوم جو فکر و احساس کے اپنے خاص زاویے رکھتی ہو اور اُن کے مطابق جس نے آٹھ نو سو سال خود بھی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہو اور دوسری قوموں کے زاویے بدلنے کے لیے بھی ہمت آزما رہی ہو اُس کی حیثیت اُس پرکاہ کے برابر نہیں ہوتی جسے سیاسی طوفان یا فوج و سپاہ کے ریلے جس طرف چاہیں بہا کر لے جائیں۔ اِس قوم کو اندر سے بدل ڈالنا اور دنیا سے بھی اس کے اثرات کو مٹا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے بڑی طویل جد و جہد درکار ہے۔

مسلمان قوم جب اپنے اصل مقصد کو، جو اس کی قوت و حرارت کا سرچشمہ تھا، بھول کر اضمحلال کا شکار ہو گئی تو مغرب کی استعمار پسند قوموں نے اس پر قبضہ کر کے اسے لوٹنا شروع کیا۔ ابھی اس استحصال کو دو صدیاں بھی گزرنے نہ پائی تھیں کہ خود ان مغربی قوموں میں یکے بعد دیگرے دو عالمگیر جنگیں ہوئیں جنہوں نے انہیں اتنا کمزور کر دیا کہ اب ان کے لیے اسلحہ و بارود کے ساتھ مسلمانوں پر مسلط رہنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ لیکن ان کے منہ کو اس مظلوم قوم کے خون کی جو چاٹ لگی ہوئی تھی وہ انہیں برابر کوئی ایسی تدبیر کرنے پر اُبھار رہی تھی جس سے سیاسی گرفت کے نہ ہونے کے باوجود وہ انہیں بندۂ بے دام بنائے رکھیں۔ اس کے لیے بڑے غور و خوض کے بعد مغربی سامراج اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قوم سے تیر و تفنگ یا سیاسی اقتدار کا چھین لینا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ایمان کا سلب کر لینا ضروری ہے، کیونکہ جب تک اس کے اندر ایمان کی چنگاری

موجود ہے یہ راکھ کا ڈھیر نہیں بن سکتی کہ جس کے ذرات کو دوسری قومیں جس طرح چاہیں منتشر کر سکیں۔ پھر اس ایمان کے ساتھ وہ کسی باطل نظریۂ حیات کو آسانی سے اپنانے پر آمادہ بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس قوم کے ایمان میں اپنی دنیا الگ بسانے اور باطل کو جلا کر خاکستر کرنے کا ولولہ موجود ہے۔ چنانچہ اس قوم کو متاعِ ایمان سے محروم کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ سامراج نے رخصت ہونے سے کافی مدت پہلے ایک ایسا طبقہ تیار کیا جو اس قوم کی آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان ہونے کے بجائے مغربی افکار و نظریات کا پرستار ہو۔ اور رختِ سفر باندھنے سے پہلے اقتدار و اختیار کی باگیں اس طبقے کے ہاتھ میں دے کر وہ اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوا کہ یہ طبقہ اس کی عدم موجودگی میں وہ سارے کام بطریقِ احسن انجام دیگا جو مغربی سامراج اپنے دورِ اقتدار میں کرتا رہا ہے۔

اِدھر یہ مغرب پرست طبقہ اپنے اپنے ملک میں مغربی آقاؤں کی خواہش اور تمنا کے مطابق اس قوم کو دین سے دُور لے جانے کی کوشش میں منہمک ہوا، اور دوسری طرف قوم کے اندر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ اُبھرنے لگا کہ اب آزاد ہونے کے بعد بھی اگر اُسے متاعِ آزادی سے محروم ہی رہنا ہے اور اسے اپنی دنیا غیروں کے نقشے کے مطابق ہی تعمیر کرنی ہے تو پھر حصولِ آزادی کے لیے جان و مال کی اتنی بے پناہ قربانیوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر استعمار کی جونک کو اس کا خون پہلے کی طرح ہی چُوسنا ہے اور اُسے اغیار کے بتائے ہوئے راستے پر بالکل بے بس ہو کر ہی چلنا ہے تو پھر یہ تو سراسر خسارے کا سودا ہے۔ کیونکہ بدیشی آقا طاقتور اور ترقی یافتہ قوم سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زیادہ مستعد، ذہین اور فرض شناس تھے اور اس بنا پر ان دیسی آقاؤں کی بہ نسبت اُس کے جان و مال کی بہتر طور پر حفاظت کر سکتے تھے، لہٰذا آزادی کے بعد اگر ہماری قسمت نہیں بدلنی تو پھر اس نام نہاد آزادی کے لیے ساری جدوجہد اور قربانی بالکل بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

محرومی اور ناکامی کے اس احساس نے قوم کے اندر دو طبقوں کو جنم دیا۔ ایک طبقہ تو وہ تھا جس نے

یہ محسوس کیا کہ اُس نے جنگِ آزادی میں شریک ہو کر غلطی کی ہے۔ یہ قوم ابھی آزادی کے لیے ذہنی اور اخلاقی طور پر تیار نہ تھی اور اسے قبل از وقت آزادی مل گئی اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ ہمت ہار کر بیٹھ گیا۔ اس طبقے کے نقطۂ نظر میں بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ جس چیز کو آزادی کی صلاحیت اور اہلیت قرار دے رہا ہے وہ سامراج اپنے دورِ اقتدار میں کس طرح پیدا ہونے دے سکتا تھا۔ اس کی تو کوشش ہی یہی تھی کہ ان لوگوں کے اندر یہ صلاحیت کسی طرح بھی اُبھرنے نہ پائے۔

دوسرے طبقے نے جسے عوامی تائید حاصل تھی، ملکی معاملات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ آزادی کے بعد ملت کی ان خواہشات اور تمناؤں کو پورا کیا جائے جن کے لیے ہی دراصل آزادی کی جدوجہد کی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں قریب قریب ہر جگہ اس حکمران طبقے کے ساتھ اس کی کشمکش شروع ہو گئی جس کے پاس لشکر و سپاہ کی بہت بڑی تعداد ہے، جس کے قبضے میں پورے پورے ملکوں کے وسائل ہیں، اور جس نے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ یہ کشمکش کہیں تو جذبات کی تلخیوں کی شکل اختیار کر رہی ہے، کہیں اس سے فکری اور ذہنی انتشار رونما ہو رہا ہے۔ ——————

—————— کہیں اس نے حاکم و محکوم کے درمیان بُعد و بیگانگی کی صورت اختیار کر لی ہے، اور کہیں اس نے اپنے ہی بھائی بندوں کے درمیان قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا ہے۔ انڈونیشیا میں جو کچھ ہوا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس پورے المیے کے پیچھے ایک طویل کشمکش ہے جو بدقسمتی سے سارے اسلامی ممالک میں اس وقت برپا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور یہ کشمکش وہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو۔ اس بنا پر انڈونیشیا میں کوئی ایسی چیز واقع نہیں ہوئی جس سے دوسرے اسلامی ممالک بالکل محفوظ و مامون ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس ابتلا سے بچائے اور اپنی رحمتِ خاص سے معاونت اور دستگیری کر کے انہیں اس شر سے نکال لے۔ لیکن جہاں تک حالات کے بہاؤ کا تعلق ہے اُسے دیکھنے سے مستقبل کی بڑی بھیانک تصویر سامنے آتی ہے۔

یہ تو ہے دنیائے اسلام میں اس کشمکش کا داخلی پس منظر۔ اس کے خارجی حالات میں ایک نمایاں

تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ مغرب نے اسلام کے خلاف سازش کا جو منصوبہ بنایا تھا اب اس میں مشرق کی اشتراکیت بھی ایک نمایاں حیثیت سے شامل ہو گئی ہے، اور مغربی استعمار اس سے خوش ہے کہ اسلام اگر اشتراکیت کی چھری سے ذبح ہو سکتا ہو تو اسی سے ذبح ہو جائے۔ اس نئے عنصر کی آمد کے چند وجوہ ہیں:

(۱) مغرب کا سرمایہ داری نظام اور اس کے ساتھ وابستہ تہذیب، دونوں خود ہی اضمحلال کا شکار ہیں اس کی غیر متوازن معاشی ترقی نے اُسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اشتراکیت کے اصولوں کو اپنائے۔ چنانچہ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اشتراکیت کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو۔

(۲) مسلمانوں کے دلوں میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر جس سامراج کے خلاف سخت حقارت اور نفرت کا جذبہ موجود ہے وہ ایسی سامراجیت ہے جس کے ساتھ مسیحیت بھی آئی تھی۔ چنانچہ اُن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ سامراج وہی زیادہ قابلِ نفرت ہے جو صلیب کا نشان لیے ہوئے آئے۔ اس لیے اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں پر غیر اسلامی نظریات کو مسلط کرنا اشتراکیت کے ذریعہ سے نسبتاً زیادہ آسان ہے جس کے ساتھ کوئی مذہبی نشان لگا ہوا نہیں ہے۔

(۳) مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام کسی تحریک کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس پر انحطاط کا عالم طاری ہے اور اس میں اب یہ خو باقی نہیں رہی کہ دنیا کی کوئی قوم اسے ایک نصب العین کی حیثیت سے اپنا کر اپنی عملی جدوجہد کے لیے اس سے حرکت اور حرارت حاصل کرے۔ یہ نظام اب محض زندہ ہے۔ اس میں لوگوں کے قلب و دماغ کو مسخر کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اس کے مقابلے میں اشتراکیت ابھی ایک زبردست قوتِ فکر و عمل ہے۔ یورپ میں رُوس نے اور ایشیا میں چین نے اسے اپنا کر مختصر سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یہاں کے عوام خصوصاً چینی عوام میں توسیع کا زبردست ولولہ موجود ہے۔ اس لیے اس نظام میں لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کی ابھی چمک دمک باقی ہے۔

(۴) مغربی سرمایہ داری نے جس اصول کو اپنا کر ترقی کی تھی اس کی بنیاد عدمِ مداخلت LAISSEZ FARE پر تھی۔ اسی بنا پر وہاں آزاد معیشت کے ساتھ جو سیاسی نظام پروان چڑھا وہ جمہوریت اور آزادیٔ رائے ہے۔ لیکن تجربہ نے اہلِ مغرب پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی جمہوری نظام جس میں آزادیٔ اظہارِ رائے ہو اور جس میں حکومتوں کا بننا اور بدلنا عوام کی رائے پر موقوف ہو، اُن کے مقاصد کے لیے مسلمان ممالک میں کسی طرح بھی مفید اور کارآمد نہیں ہے کیونکہ مسلمان عوام نہ تو اپنی مرضی سے اپنی روایات کو ترک کرنے پر تیار ہوتے ہیں اور نہ مذہب کو تیاگ دینے ہی پر آمادہ ہو سکتے ہیں، بلکہ ان "جاہلوں" کو جب بھی اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملتا ہے تو لاکھ جتن کرنے کے باوجود وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم اسلامی نظامِ حیات ہی میں اپنی فلاح و کامرانی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس لیے آزادی و جمہوریت اس قوم کے لیے کسی جہت سے بھی موزوں نہیں ہے۔ انہیں "راہ راست" پر لانے کے لیے کوئی ایسا نظام درکار ہے جو انہیں بالجبر غیر اسلامی اقدار کا فدائی اور پرستار بنا دے اور قوت کے زور سے ان کے اندر اسلام کے سارے نقوش مٹا ڈالے۔ یہ مہم اشتراکیت کے ذریعہ سے زیادہ اچھی طرح سر ہو سکتی ہے۔

(۵) اشتراکی نظام ڈکٹیٹروں کو بھی زیادہ اپیل کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے انہیں ایک ملک کے تمام وسائلِ رزق پر کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے اور پوری قوم ان کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہو جاتی ہے۔ وہ اشتراکیت کے اس جُز کو تو پسند نہیں کرتے کہ حکومت لوگوں کو روزی مہیا کرنے کا ذمہ لے، مگر اس کا یہ جُز انہیں بہت پسند آتا ہے کہ تمام ذرائع پیداوار پر حکومت کا قبضہ ہو جائے۔

(۶) اسے ہماری قومی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ماضی اور حال میں بعض ایسے خود غرض اور دنیا پرست اصحابِ اقتدار پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کے مقدس نام پر اس ملت کے ساتھ بڑا شرمناک کھیل کھیلا اور اللہ کے دین کو محض ناجائز استحصال کا ذریعہ بنایا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے اندر فی الحقیقت ایک ذہین طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو اگرچہ اسلام کی صداقت کا قائل ہے لیکن اس امر سے بہر حال مایوس ہو چکا ہے کہ اب یہ کبھی دنیا کی رہنما قوت بھی بن سکتا ہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل پر علما کے جھگڑوں نے ان کو مذہب سے اور بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اب مسلمان

قوم کی نجات اسی میں سمجھتا ہے کہ کوئی ایسی تحریک اپنا لی جائے جس میں اس مقدس نام پر لوٹ کھسوٹ کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو اور جو لوگ اس کی آڑ میں سادہ لوح عوام کو لوٹ رہے ہیں، اُن کا بیسر خاتمہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ان کی نظر میں اگر کوئی تحریک جچتی ہے تو وہ سرمایہ داری نہیں بلکہ اشتراکیت ہے۔

اشتراکیت، سرمایہ داری کی بہ نسبت مسلمانوں کو ایمان سے محروم کرنے کے لیے کتنی مفید ہے، اور اگر انہیں غیر اسلامی اقدار کا پرستار بنانا مطلوب ہو تو اس مقصد کے لیے وہ کس قدر ناگزیر ہے، اس کے متعلق ایک محقق مسٹر سنیائے کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں۔ مسلم قوم کے ہر فرد کو ان پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے:

"بدقسمتی سے جمہوریت ہر زہر کا تریاق نہیں اور یہ ہر قسم کے حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ انسانی ترقی کی بعض منازل میں ایک ایسی زبردست آمریت درکار ہوتی ہے جو ماضی کے ملبے کو پوری طرح ہٹا کر زمین ہموار کر دے اور جبر کے ساتھ جاہل اور تنگ نظر عوام کو ضروری تبدیلیاں قبول کرنے پر مجبور کر دے ... اس کے لیے ایک نئی قیادت درکار ہے۔ ... ایسی قیادت جو سخت گیر اور جابر ہو اور جمہوری طریقوں سے حکمرانی کرنے کا برملا انکار کر دے۔ اُس قیادت کے سامنے ہمیشہ دو مقاصد ہونے چاہییں۔ ایک یہ کہ پورا سماج یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قوم کو ڈسپلن اور ضبط کے آہنی شکنجوں میں جکڑ کر رکھا جائے۔ اس نئی قیادت کا یہ عین فرض ہے کہ وہ ایک ہی وار میں قوم کا ماضی سے رشتہ کاٹ کر اُسے نئی عادات اور نئی اقدار کا پابند بنائے۔ اس کے لیے اُسے اگر کلیت پسند ریاست نہیں تو کم از کم آمرانہ اختیارات کی حکومت تشکیل کرنا چاہیے۔ جو نہ صرف سابق نظام کے آخری نشان کو بڑی جرأت کے ساتھ مٹا دے بلکہ عوام کی موجودہ روش میں بھی تبدیلی پیدا کرے اور اُن کے نظام عقائد، اُن کے رسوم اور اُن کے اعمال کا بڑی سختی سے محاسبہ کرے۔ اس راہ میں اُسے فرد کے حقوق اور اسی نوعیت کے دوسرے تحفظات یا کسی طبقے

کے مفادات کو قطعاً حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔ اس قیادت کو سنگلاخ زمین کی طرح مضبوط اور سخت ہو کر حکومت کی زمام کار سنبھالنے کے لیے منظم ہونا چاہیے اور قوم کو ایک ایسے نئے اور حرکت آفرین تصورِ حیات کا پرستار بنانا چاہیے جو مذہب اور اُس کی روایات کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دے۔"

اہلِ مغرب مشرقی ممالک کے لیے اصلاح کا جو پروگرام رکھتے ہیں اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لیے جس قسم کی قیادت کو جس فکر و نظر اور جذبہ و عمل کی جن صلاحیتوں کے ساتھ اُبھارنا چاہتے ہیں، اس کا تذکرہ تو آپ نے سُن لیا۔ اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ اس مصنف کے نزدیک ان اغراض کے لیے اشتراکیت کیسی غیر معمولی افادیت کی حامل ہے:

"اشتراکیت اس بیسویں صدی میں سرمایہ دارانہ انقلابات کا نہایت عمدہ اور مؤثر بدل ہے۔ ایسے معاشرے جو بعض روایات کے پابند تھے اور جنہوں نے ان انقلابات کو ناکام بنا دیا، اُن میں اشتراکیت کو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی۔ مانا کہ یہ نظام ظالمانہ، اور کلیت پسندانہ ہے اور اس کی جکڑ بندیاں بڑی سخت ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ کسی پس ماندہ معاشرے میں صنعتی انقلاب کے لیے یا اُسے معاشی اور تعلیمی اعتبار سے "جدید" بنانے یا دوسرے لفظوں میں مغربی افکار و نظریات اور مغربی روایات کا علمبردار بنانے کے لیے اشتراکیت سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی دوسرا حربہ نہیں ہو سکتا۔ پھر چونکہ اس نظام میں کسی قوم کے اپنے مخصوص ماحول کی روایات کو جو اُس کے اندر پوری طرح رچی بسی ہوں، بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی غیر معمولی قوت ہے، اس لیے اس نے صنعتی سماج کی تعمیرِ نو میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس میں لامحدود قوت کے علاوہ پوری قوم کو کام پر لگانے، معاشرے کو زیر و زبر کرنے اور اس راہ میں جو حائل ہو اُسے بے پناہ جبر و استبداد کے ساتھ ہٹا دینے اور اس جد و جہد میں پوری بے حسی کے ساتھ عوام پر دستِ ظلم دراز کرنے اور اس کے نتیجے میں ان کے مصائب کو بالکل بے پروائی کے ساتھ دیکھنے

کی بھی غیر معمولی طاقت ہے۔

اشتراکیت نے اپنے اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے ریاستی سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کا طبقہ پیدا کیا ہے جو مغربی طرزِ فکر کے مطابق نئی مصنعتی معیشت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اس طبقے کی دریافت یا تشکیل اشتراکیت کی نمایاں کامیابی ہے ... یہ نیا طبقہ انیسویں صدی کے پرانے سرمایہ داروں کی جگہ جدید، ظالم، زیادہ طاقتور اور بااختیار سرمایہ داروں کا ایک ایسا مضبوط طبقہ ہے جو ہر نقشِ کہن کو مٹا کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے ..... اشتراکیت کے مقاصد اور طریق کار میں بڑا تناقض اور تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کا ظالمانہ ہتھکنڈوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے یہ ایک طرف لوگوں کو پرانے اوہام اور روایات سے نجات دلاتا ہے اور دوسری طرف انہیں پوری مذہبی تنگ نظری اور پورے تعصب کے ساتھ ایک نئے تصورِ حیات کو اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔ نیز انہیں سیاسی آمریت اور مطلق العنانیت کا خوگر بھی بناتا ہے۔ یہ قوموں کا رشتہ دنیائے مغرب سے توڑتا ہے لیکن انہیں آخر کار اسی کا پیرو اور مقلد بنانے کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے۔ یہ مغرب کے خلاف پورے زور کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتا ہے لیکن انہیں بہر حال اسی کی نقالی کی دعوت دیتا ہے اور انہیں وہی روش اختیار کرنے پر ابھارتا ہے جس پر مغربی اقوام اس وقت گامزن ہیں۔[1]"

اہلِ مغرب کے خطرناک عزائم، اُن کی تکمیل کے لیے اشتراکیت کی غیر معمولی افادیت، اور مسلمان قوم کے مزاج اور اس کے ذہنی اور جذباتی پس منظر کو سامنے رکھ کر انڈونیشیا کے حالات پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان ملک میں جو کچھ ہوا ہے وہ طویل سازش کی محض ایک کڑی ہے، اور آج پوری دنیائے اسلام میں جو اضطراب بے چینی بلکہ کشمکش پائی جاتی ہے وہ اسلام کے خلاف مغربی حکمتِ عملی کا ایک نتیجہ ہے۔

پھر انڈونیشیا کے حالات دیکھ کر یہ حقیقت بھی پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مغرب کے ارادے ناپاک ہی سہی مگر ان کی نوعیت مجرد معاشی استحصال سے بدل کر نظریاتی اور تہذیبی استحصال کی بن گئی ہے۔ پوری دو صدیوں

---

[1] A CHALLENGE TO MODERNISATION p. 217-223

کے سیاسی اور معاشی تفوق کے بعد دنیا نے جو رُخ اختیار کیا ہے اُس میں نیشنلزم کے بل بوتے پر کسی قوم کا زندہ رہنا قریب قریب ناممکن ہوگیا ہے۔ اب اگر دنیا میں کسی قوم کو عزت کے ساتھ جینا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کا تصورِ حیات، اس کی تہذیب، اس کا تمدن دنیا میں غالب ہو اور اُس کے مقابلے میں جتنے افکار و نظریات اور جتنے دوسرے نظامہائے زندگی ہوں وہ بالکل مغلوب و مفلوج ہوں۔ ان بدلے ہوئے حالات میں اب کسی قوم میں سے محض کرائے کے ایجنٹ تلاش کر کے کوئی طاقتور قوم یا غالب تہذیب اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جن قوموں کو اب مٹانا مقصود ہے سب سے پہلے اُن کے تصورِ حیات پر کاری ضرب لگانا ناگزیر ہے تاکہ وہ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق نہیں بلکہ غالب قوم کے تصورِ زیست کے مطابق زندگی گزاریں۔ ظاہر بات ہے کہ فکر و نظر کا یہ انقلاب اُن لوگوں کے ہاتھوں تو برپا نہیں کیا جا سکتا جو غیر ملکی سامراج کے آلۂ کار ہونے کی وجہ سے اپنی قوم میں کسی عزت اور وقار کے مستحق نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے سینائی کے تجربہ کے مطابق ایک ایسی قیادت کو جنم دینا ضروری ہے جو تنہائی کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتی ہو، قوم کو بھی اس کے خلوص اور قوتِ عمل پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہو، اور وہ غیر ملکی ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ قوم کی سچی غم خوار اور مخلص و مساز بن کر اُس کے فکر و نظر کے زاویوں کو اہلِ مغرب کی خواہش کے مطابق بدل دے۔ مغربی قومیں مسلمان ممالک کی قیادتوں سے یہ کام اتنی گہری سازش اور عیاری سے لے رہی ہیں کہ انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ قوم کی محبت اور اُس کی غربت اور افلاس کے غم میں کر رہی ہیں درحقیقت وہ قوم کی فلاح نہیں بلکہ بربادی ہے اور وہ بالکل نادانستہ طور پر مغرب کے ناپاک مقاصد کی تکمیل میں بطور آلۂ کار استعمال ہو رہی ہیں۔

آیئے اب انڈونیشیا کے انقلاب کے آئینہ میں مغرب کی ان نئی حکمتِ عملیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

مسلم قوم کا یہ ایک وسیع و عریض ملک تین سو سال تک ولندیزی سامراجیت کا شکار رہنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں آزاد ہوا۔ آزادی کی جدوجہد میں اگرچہ مختلف افراد اور جماعتیں شریک ہوئیں مگر اس کے محرکات میں صرف ایک ہی محرک کارفرما تھا کہ اس قوم کی اجتماعی زندگی کی تشکیل اُس نقشے کے مطابق نہیں جو اُسے اسلام سے ملا ہے جب تک آزادی کی جنگ جاری رہی تعمیرِ نو کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ عوام نے جہاد کے مقدس جذبے

کے ساتھ جان و مال کا ایثار کیا اور طویل کشمکش کے بعد ملک کو دلندیزی چنگل سے آزاد کرایا۔ اس جنگ میں ایک دین پسند جماعت یعنی ماشومی پارٹی نے بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں، البتہ قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہی، جو اگرچہ دین کا مخالف اور دشمن نہ تھا مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی ضابطۂ حیات کا کوئی اچھا نمونہ بھی نہ تھا۔ اس شخص کو بہرحال جدوجہد کے اس دور میں اس لیے گوارا کیا گیا کہ آزادی وطن کی تحریک کا یہ نہ صرف ایک آزمودہ کار اور مخلص کارکن تھا بلکہ سامراج کے جوڑ توڑ اور سازشوں سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے اس کا جم کر مقابلہ کر سکتا تھا۔

آزاد ہونے کے بعد جب ملک کی تعمیرِ نو کا مسئلہ پیش آیا تو پوری قوم نے یہ محسوس کیا کہ سکارنو کی قیادت میں ملک چاہے اور کچھ بن جائے تو بن جائے مگر اسلامی نہیں بن سکتا۔ دوسری طرف اس قائد نے بھی حالات کا پوری طرح اندازہ کرتے ہوئے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ اسلام انسان پر جس قسم کی حدود و قیود عائد کرتا ہے اور انسانی خواہشات پر جس نوعیت کی پابندیاں

لگاتا ہے اُس کا مزاج اور اُس کی طبعی افتاد اُن کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک پسماندہ انحطاط پذیر ملک میں اسلامی نظام کا قیام اُس کے بس کا روگ نہیں۔ اِن وجوہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُس کے لیے دو ہی راستے ہیں، یا تو وہ خود تختِ اقتدار سے ہٹ کر اُن لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دے جو قوم کو انفرادی اور اجتماعی طور پر صحیح معنوں میں مسلمان بنانے کی اہلیت رکھتے ہوں، یا اگر اُسے اقتدار عزیز ہے تو پھر اُسے قوم کو اسلام کی جگہ ایک نیا فلسفۂ حیات اور نیا نصب العین دینا چاہیے اور آہستہ آہستہ اُس کے قلب و دماغ میں سے اسلام کی محبت مٹا کر اُس کی جگہ اپنے دل پسند نظریات کو قبول کرنے کی امنگ پیدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سیکولر ذہن کا اختراع کیا ہوا ایک نیا دین "پنج شیلا" وضع کیا گیا۔ یہ دین پانچ اصولوں پر قائم تھا۔ ایک خدا کا اقرار، دوسرے قوم پرستی، تیسرے جمہوریت، چوتھے انسان دوستی، اور پانچویں معاشرتی انصاف۔ اس نئے دین کی اساس پر انڈونیشیا کے عارضی دستور کی بنیاد رکھی گئی۔

سکارنو کے مالک الملک اور خالقِ کائنات کے بارے میں کیا تصورات تھے، اِس کا اندازہ اُس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس نے قصرِ جمہوریہ میں دفاعِ پنج شیلا کونسل کے سامنے ۱۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو کی اور جسے وزارت اطلاعات نے بڑے اہتمام سے طبع اور شائع کیا۔ اس تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"میں سرزمینِ انڈونیشیا کا ایک کسان ہوں۔ اِس میدان میں سب سے پہلے مَیں نے جس کا مشاہدہ کیا وہ مذہبی اسپرٹ ہے، کیونکہ انڈونیشی قوم زراعت پر گزر بسر کرتی ہے اور جو قوم زراعت پر گزر بسر کرتی ہو وہ لازماً مذہب پرست ہوگی۔ مَیں نے ابھی اقرارِ خدا کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ مذہبی اسپرٹ کہا ہے جس سے میری مراد غیبی قوتوں کے وجود کا عقیدہ ہے جو ہماری زندگی پر کارفرما ہیں۔ اس عقیدے کا احساس ہم اُس قوم کے اندر پوری شدت سے پاتے ہیں جو زراعت پر گزر اوقات کرے۔ یہ ہے بھی درست۔ کاشتکار شخص اپنے دل کی گہرائیوں کے اندر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس دنیا میں ایک غیبی قوت موجود ہے جس پر اس کی تمام محنتوں اور مشقتوں کا دارومدار ہے۔ مثلاً کاشتکار بارش کا آرزومند ہوتا ہے۔ اس آرزو کو پورا کرنے کی وہ کس سے درخواست کرے؟"

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ سکارنو کی اس تقریر کا پورا اقتباس نقل کیا جائے۔ شائقین حضرات اسے جناب خلیل حامدی صاحب کی تصنیف "نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں" کے اندر خود دیکھ سکتے ہیں۔ محولہ بالا عبارت پڑھنے سے اس امر کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سکارنو صاحب خدا کے بارے میں وہی باطل اوہام رکھتے ہیں جو مغرب کے ملحدانہ فلسفے کی پیداوار ہیں۔ اس معاملے میں اشتراکی ملاعدہ اور غیر اشتراکی ملاحدہ میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔ یہ سارے حضرات باری تعالیٰ کو محض ایک واہمہ خیال کرتے ہیں جسے انسان کی بے بسی اور مجبوری اُس کے قلب و دماغ میں جنم دیتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں سے جب ظلمت و تاریکی دُور ہوگی، اور وہ کائنات میں علت و معلول کی کڑیوں کو سمجھنے لگے گا، اور بے بسی اور بے چارگی کے عالم سے نکل کر کائنات میں تصرف کرنے کی قدرت اپنے اندر پیدا کرے گا تو وہ خدا سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اسی تاریکی اور ظلمت کو یہ شخص مذہبی اسپرٹ کہہ رہا ہے۔ سکارنو کے نزدیک باری تعالیٰ کوئی مستقل قائم بالذات ازلی و ابدی

اور بااختیار ہستی نہیں بلکہ سراسر ایک اضافی اور عارضی واہمہ ہے جو معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ زرعی دور میں ایک نوعیت کا خدا ہوتا ہے، اور معاشرہ جب اس دور سے ترقی کر کے صنعتی دور میں داخل ہوتا ہے تو خدا کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے، آخر کار تسخیرِ کائنات کے بعد اس کی قطعاً کوئی ضرورت اور حاجت باقی نہیں رہتی۔

ماشومی پارٹی کے ایک متقدر رہنما اور اسلام کے ایک عظیم فدائی جناب ڈاکٹر محمد ناصر نے، جو جنگِ آزادی میں سکارنو کے ہمرکاب تھے مجلس دستور ساز میں اسلامی دستور کی حمایت کرتے ہوئے سوکارنو کے اس نظریہ پر زبردست گرفت کی اور کہا:

"اس کی اساس وحی سے ماخوذ نہیں بلکہ یہ محض انسانی غور و فکر کا ثمرہ ہے۔ پھر اس کے اندر نہ تو حاکمیتِ الٰہی کا اعتراف پایا جاتا ہے اور نہ اُن ذمہ داریوں کا کوئی تصور موجود ہے جو حاکمیتِ الٰہی کے اقرار کے بعد حاکم اعلیٰ کی اطاعت کے سلسلے میں وارد ہوتی ہیں۔ اقرارِ خدا کا یہ نظریہ اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ اس میں خدا کے وجود کا ایک مجرد تصور موجود ہے جس کے ساتھ وحی اور اس کی پیش کردہ ذمہ داریوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اللہ کے وجود کا بھی وہ تصور اختیار کیا گیا ہے جو ایک اضافی اور قابلِ تغیر چیز ہے اور انسان کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔"[1]

ڈاکٹر محمد ناصر نے اپنی اس تقریر میں سکارنو کے صرف تصورِ خدا ہی پر بھرپور تنقید نہ کی بلکہ پنج شیلا کے اس پورے فلسفے کی فکری لغزشیں اور قوم کے لیے ان کی مضرت رسانیوں کی بھی پوری پوری وضاحت کی جسے اس نے پیش کیا تھا۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا کہ پنج شیلا کا یہ فلسفہ ایسے بے ربط اور بے جوڑ عناصر کا مجموعہ ہے جن میں کوئی مقصدی ترتیب نہیں پائی جاتی، اس لیے یہ کسی قوم کا فلسفۂ حیات نہیں بن سکتا۔ کسی نظریہ کو زندگی کی غایتِ اولیٰ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس نظریہ کے فکری اور عملی گوشوں میں مکمل ہم آہنگی ہو اور اس کا پورا نظامِ فکر، نظامِ اخلاق، نظامِ معیشت، نظامِ معاشرت ایک بنیادی تصورِ حیات کے رُخِ زیبا کا عکس ہو۔

---

[1] "نظامِ اسلامی مشاہیرِ اسلام کی نظر میں"۔ مرتبہ جناب خلیل احمد حامدی صاحب صفحہ ۳۵۰

لیکن پنج شیلا کسی اساسی قدر کا ترجمان نہیں۔ اس کے مختلف اجزا اور عناصر کو ہر شخص اپنے ذوق اور منشا کے مطابق قبول کر لیتا ہے اور جس اصول کو چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ مثلاً اشتراکی اقرارِ خدا کے اصول کو بلا تامل مسترد کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود پنج شیلا کے پلیٹ فارم پر متحد ہونے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر مسلمان اپنے دینی تقاضوں کے تحت اس بیکار فلسفے کو اپنانے سے انکار کرتا ہے تو اُسے قوم اور وطن کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے اپنی اس تنقید میں پنج شیلا کے علمبرداروں کے عملی تضاد کی بھی نہایت عمدہ انداز میں نشاندہی کی اور دلائل سے ثابت کیا کہ جمہوریت کا دم بھرنے والے اور قومی تعمیر و ترقی کے لیے مختلف فلسفے گھڑنے اور منصوبے بنانے والے اسلام کے معاملے میں کتنا جمہوریت کُش طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ پنج شیلا کے نظریہ کے تحت جمہوریت کو مملکت کا ایک رہنما اصول مانتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے ملک کی اکثریت کے احساسات و جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہاں اس نظامِ زندگی کو نافذ کرنے کی کوشش کریں جس کا وہ تقاضا کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ نظام حکمران طبقے کے مخصوص مفادات کی حفاظت نہیں کرتا اس لیے اسلام کو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی بھی قلعی کھولی اور یہ بتایا کہ ان کی حیثیت دلفریب اور کھوکھلے نعروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اُس نظریۂ حیات پر غور کرنا ہوگا جس کے منبع سے یہ تصورات سیراب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اشتراکیت انسان دوستی کا جو تصور رکھتی ہے وہ اسلام سے یکسر مختلف ہے۔ ایک کمیونسٹ ریاست انفرادی ملکیت کو انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کے لیے سمِ قاتل سمجھتی ہے لیکن اسلامی ریاست میں انفرادی ملکیت، انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کے لیے ناگزیر شرط ہے، کیونکہ اگر اس سے دین کے مطابق استفادہ کیا جائے

(باقی صـ۵۵ پر)

(بقیہ اشارات)

تو اس سے انسان کے پاکیزہ احساسات اور مقدس جذبات کو پرورش پانے کا موقع ملتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر ناصر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ ایران کو بتایا کہ قومی اتحاد و اتفاق کے لیے اس قسم کے احمقانہ اور بے ربط فلسفے کسی پہلو سے بھی مفید اور کارآمد نہیں ہوتے۔ ان سے سوائے فکری اور عملی انتشار کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اتحاد و اتفاق بلاشبہ قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے لیکن یہ آج تک بجائے خود کسی قوم کا مطلوب و مقصود نہیں بن سکا۔ اس کا مظاہرہ قوموں نے کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کے لیے کیا ہے۔ جب ایک قوم کسی نظریۂ حیات کو دل و جان سے اپنا لیتی ہے تو بالکل فطری طور پر اس کے اندر اتفاق و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ ایران کے سامنے اربابِ اختیار کی موجودگی میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ یہ بتایا کہ انڈونیشی قوم اگر دنیا میں عزت و آبرو کا کوئی مقام حاصل کر سکتی ہے تو وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو نظریہ اس قوم کا جوہرِ حیات ہے اور جس کی روایات اس کی زندگی کی گہرائیوں میں اتر چکی ہیں اور جو انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی کامرانی کی ضمانت ہے، اُسے اس ملک کی تشکیلِ نو میں پورے شعور اور عزم کے ساتھ بطور اساس قبول کر لیا جائے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کی ساری مخلصانہ باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا سوکارنو صاحب پنج شیلا کے فلسفے کو سامنے رکھ کر سرگرمِ عمل رہے۔

اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح سوکارنو صاحب کے اختراعی فلسفے یا پنج شیلا میں بھی بنیادی خامی یہ تھی کہ اس قسم کے بے ربط نظریات کے یہ ملغوبے بڑے بے جان ہوتے ہیں اور یہ کبھی بھی کسی فرد یا قوم کے لیے فکر و عمل کے محرکات فراہم نہیں کر سکتے۔ ان سے نہ تو زندگی میں فکری ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ

عمل کی حرکت اور حرارت ۔ بلکہ یہ انسان کے قلب و دماغ میں ایک نظریاتی خلا پیدا کر دیتے ہیں جسے وہ دوسرے نظریات سے پُر کرتا ہے ۔

یہی صورت حال انڈونیشیا میں پیش آئی ۔ اتفاق و اتحاد کی غرض سے قوم کو اسلام جیسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم رکھا گیا اور اُسے پنج شیلا جیسے بے جوڑ فلسفے کو اپنانے کی تلقین کی گئی ۔ مگر چونکہ اس بے جان اور بے ربط نظریے سے انسان کو نہ ذہنی سکون اور اطمینان میسّر آتا تھا اور نہ اُس کی عملی زندگی میں کوئی حرکت پیدا ہو سکتی تھی اس لیے "جائے خالی را دیو می گیرد" کے بمصداق آہستہ آہستہ اشتراکیت کی جڑیں پھیلنی شروع ہو گئیں ۔

دوسری طرف سکارنو کی جو طبعی افتاد تھی اسے اسلام تو کسی صورت بھی گوارا نہ تھا ۔ یہ شخص زبان کے استعمال میں بڑا مطلق العنان ہے اور عمل کی کمی کو کھوکھلے نعروں سے پُر کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے پھر صنف نازک کے معاملے میں بھی یہ اپنے جذبات پر قطعاً قابو نہیں رکھ سکتا ۔ عورت اس کی بہت بڑی کمزوری ہے ۔ ان کمزوریوں کی موجودگی میں سکارنو دنیا کی ہر چیز برداشت کر سکتا تھا مگر اسلام کے بندھن اُس کے لیے کسی طرح بھی گوارا نہ تھے ۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں اُس نے کمیونسٹ جماعت کی باقاعدہ حمایت شروع کر دی ۔ یہ پارٹی چونکہ ایک بڑی فعّال اور سرگرم جماعت تھی اس لیے سکارنو نے یہ سمجھا کہ اس کی تائید کر کے وہ اس کی قوتِ عمل سے بھرپور فائدہ اٹھائے گا ۔ لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے جلد ہی اس کے ہاتھوں میں مغلوب ہو کر رہ جائے گا ۔

کمیونسٹ پارٹی نے سکارنو کو شیشے میں اتارنے کے لیے سب سے پہلے اُس کی جس کمزوری سے فائدہ اٹھایا وہ شہرت اور ناموری کا بے پناہ جذبہ تھا ۔ چنانچہ کمیونسٹ پریس نے اُس کی تعریف و توصیف میں بالکل بے سروپا باتیں لکھنا شروع کر دیں ۔ اُسے انقلاب کا عظیم رہنما ، انڈونیشیا کا واحد نجات دہندہ اور کسانِ عظیم کے معزز خطابات سے نوازا ۔ اُسے اپنی شعلہ بیانیاں دکھانے کے لیے جمِ غفیر فراہم کیے

تاکہ وہ اپنی زبان کے جوہر کھل کر دکھا سکے۔ اُس کی ان جذباتی تقریروں کو شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع کیا جاتا اور اُن کی مدح میں بڑے طویل اداریئے لکھے جاتے۔ سکارنو اپنی ذات کے ان طلسمات میں گرفتار ہو کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگا۔ اس کا زیادہ وقت یا تو حسینوں کے جھرمٹ میں گزرنے لگا، یا کمیونسٹ پارٹی کی تعریف اور اس کے مقابلے میں دوسری پارٹیوں پر طنز و تعریض میں، یا پھر زبان کے کمالات دکھانے میں۔ کمیونسٹوں نے اس کو یہاں تک شیشے میں اتار لیا کہ اس نے ڈاکٹر ناصر کو نظر بند اور ماشومی پارٹی کو ممنوع قرار دے کر ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو دُور کر دیا اور اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی سیلاب کی طرح پھیلنی شروع ہو گئی۔

اس خود پسند انسان کو اگر دنیا میں اب کسی چیز سے محبت رہ گئی تھی تو وہ صرف اپنی ذات اور اپنا اقتدار تھا۔ چنانچہ پنج شیلا کی جگہ اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موجودہ حالات میں تین طاقتیں اس ملک کو متوازن خطوط پر چلا سکتی ہیں نیشنلزم، اسلام اور کمیونزم۔ ان کے مجموعہ کے لیے اس نے ناساکوم کی اصطلاح گھڑی۔ اس نوعیت کی بے سروپا باتیں وہ بڑے فخر سے کرنے لگا۔ قوم پرستی، اسلام اور اشتراکیت تینوں ایسے نظام ہائے حیات ہیں جن کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ نیشنلزم اپنی قوم کے فطری تفوق اور دوسری اقوام کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت پر مبنی ہے اس لیے اسلام سے اس کا کسی طرح جوڑ نہیں ہو سکتا۔ پھر جو نظریہ ملکی مفادات کو خیر و شر کا معیار قرار دیتا ہو وہ اسلام کے ضابطۂ حیات کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے اساسی تصورات سے لے کر حیاتِ انسانی کی معمولی سے معمولی جزئیات تک اشتراکیت سے الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن سکارنو صاحب ان تینوں متناقض اور متضاد نظامہائے حیات پر اپنی قومی زندگی کی تشکیل کرنے پر مصر تھے۔ ان کا یہ بے جا اصرار ایک تو ان کے ذہنی افلاس اور دوسرے اُن کے مزاج اور اُن کے اپنے مخصوص مفادات کی وجہ سے تھا۔ قوم پرستی کا ڈھونگ رچا کر وہ اپنی قوم کے جذبات کو دوسری اقوام کے خلاف مشتعل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ غیظ و غضب میں خود اپنے قائد محترم کی کارگذاریوں پر غور نہ کرے اور

انہیں اُن کی ساری بداعمالیوں کے باوجود اپنا نجات دہندہ ہی سمجھتی رہے۔ اشتراکیت کا دم بھر کر وہ کمیونسٹ پارٹی کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور اپنی اخلاقی کمزوریوں کے لیے سندِ جواز حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور اسلام کا نام وہ اپنے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلنے اور انہیں بے وقوف بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

سکارنو اس امر کا برابر التزام کرتا رہتا کہ کسی طرح اس کی قوم کا اشتعال ٹھنڈا نہ ہونے پائے اس لیے وہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر ایسے حالات پیدا کرتا رہتا جس سے عوام ایک قسم کے ذہنی بخار میں مبتلا رہیں۔ اسی مقصد کے تحت اس نے ملائشیا پر دھاوا بول دیا اور اُس کے خلاف یہاں تک جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کیا کہ جنوری ۱۹۶۴ء میں جب اسے سیکورٹی کونسل میں نشست ملی تو سوکارنو نے کمیونسٹ پارٹی کے سربراہوں ایدت اور سوبانڈریو کے مشورے سے اقوامِ متحدہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ایک تو سکارنو کے اپنے مزاج نے، دوسرے اُس کے غلط کار مشیروں نے ایسے حالات پیدا کیے جس میں حکمت و دانائی کی بات کرنے والوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اگر یہ شخص کبھی غور و فکر پر آمادہ ہوتا بھی تو کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر فوراً اُسے بہکا کر اپنی مجنونانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ چنانچہ دیکھئے کہ ملائشیا کے بارے ہی میں ملک کے اہل الرائے کا یہ احساس تھا کہ دونوں ممالک کے اختلافات اتنے گہرے اور شدید نہیں ہیں کہ فوجی کارروائی کے بغیر ان کا حل نہ ہو سکتا ہو۔ لیکن کمیونسٹ فوجی اقدام پر بضد تھے اور سکارنو جب کبھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کا خیال کرتا تو وہ فوراً اس راہ میں حائل ہو جاتے۔ موسمِ سرما کی ایک شام سوکارنو اپنے محل میں خوبصورت لڑکیوں کے رقص سے دل بہلا رہا تھا کہ ایدت نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تم ملک کی جس لڑکی سے چاہو اُسے اپنے مصرف میں لے آؤ لیکن ملائشیا کو کچلنا نہ بھولنا۔"

سکارنو اگرچہ ایک غلط راستے پر چل نکلا تھا مگر ملک کے سنجیدہ طبقے برابر اس کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح حالات سنبھل جائیں۔ ملک کے اندر اشتراکی لٹریچر دھڑا دھڑ بک رہا تھا۔ کمیونسٹ اقتدار کی شہ پاکر عوام کے مذہبی جذبات کو کچوکے لگا لگا کر انہیں مُردہ کرنے میں منہمک تھے۔ مساجد کی بے حرمتی اور قرآن مجید کی علانیہ توہین ان کا معمول بن گیا تھا۔ ثقافت اور ادب کے نام پر لوگوں کے اندر مذہبی بیزاری پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں ہو رہی تھیں۔ کلیسوں کے اندر رقص و سرود کی محفلوں کے ذریعے نوجوانوں کے اخلاق کو برباد کیا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ اگر کسی قوم کے اخلاق کا دیوالہ پٹ جائے تو وہ پھر کسی مذہب کی علمبردار بن کر دنیا میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ مذہب اور اخلاق دونوں لازم ملزوم ہیں۔ جو قوم دنیا میں آبرو باختہ ہو جائے مذہب سے اس کا خود بخود رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور وہ انحطاط کی شکار ہو جاتی ہے اور پھر اپنی زندگی کے لیے کسی باطل فلسفۂ حیات کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انڈونیشیا میں یہی ہوا۔ نوجوانوں پر جونہی اخلاق کی گرفت ڈھیلی ہوئی وہ موج در موج اشتراکیت کی صفوں میں جا گھسے اور اس کے مبلغ اور علمبردار بن گئے۔

مذہبی طبقوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور اُن پر جس بے بسی اور بے کسی کا عالم طاری تھا اُس کا اندازہ مندرجۂ ذیل دو تقریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تقریر ایک عیسائی پادری کی اور دوسری ماشومی پارٹی کے ایک لیڈر کی ہے۔ پادری صاحب کہتے ہیں:

"کمیونسٹوں نے اشتراکیت کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بائیبل اور قرآن کی تشریح و توضیح ایسے انداز پر کی ہے جس سے یہ دونوں کتب سماوی اشتراکیت کے مشن نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ملک بھر میں کتب اور رسائل کی اشاعت اور تقاریر و اعلانات کا وسیع انتظام کیا ہے۔ اس وقت ہمیں ان پست نعروں کا سامنا ہے جو بدل بدل کر عوام کو فریب دینے کے لیے لگائے جا رہے ہیں۔ یہ اشتراکی ہمیں استعمار کے ایجنٹ اور تخریب پسند ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ اس وقت ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ آؤ ہمارے ان واعظوں

کو سنو جن میں ہم عدل و انصاف کے قیام کی اور ظلم اور شر و فساد کے قلع قمع کی دعوت دیتے ہیں، عبث اور بیکار ہے۔ اس قسم کی دعوت دینے والوں کی بات سنے بغیر ہی ان کو استعمار کا ایجنٹ کہا جاتا ہے ــــ!

یہ بات صحیح ہے کہ اب مسجد و گرجا میں سے بلند ہونے والی ہر آواز خطرناک ہے کیونکہ فوج اس کی مخالف اور اقتدار اس کا دشمن بن چکا ہے۔ مگر دین اور مذہب کی یہ مخالفت محض عارضی ہے۔ انسانی رُوح جب بھی بیدار ہوگی تو وہ مذہب ہی سے اطمینان اور سکون حاصل کرے گی۔ اگر بالفرض وہ بیدار نہ بھی ہو تو خدا کا کلمہ تو بہر حال آفاق میں پھیل کر رہیگا۔ انسان جب بھی ناکام اشتراکی انقلابوں اور مختلف دھڑے بندیوں سے مایوس اور نامراد ہوگا تو وہ مذہب کی آغوش ہی میں پناہ لے گا۔"

ماشومی پارٹی کے لیڈر نے کہا:

"محترم! آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سو فیصد صحیح اور درست ہے، لیکن آپ نے ہمیں اشتراکیت کے خلاف سرگرم عمل اور ہر محاذ پر اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی دعوت نہیں دی۔ ہمیں مسجد و کلیسا کو صرف روحانی پناہ گاہ بنانے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ انہیں قومی تحریک کا مرکز بنانا چاہیے۔ اشتراکیت ایک نظامِ حیات ہے۔ اس کے کام کرنے کی اپنی ایک مخصوص تکنیک ہے اور اُس نے دینی محاذ کو کافی کمزور کر دیا ہے۔ لیکن ہم ماشومی پارٹی سے تعلق رکھنے والوں نے قہر سلطانی اور سیاسی مخالفت کے باوجود حالات کے مقابلے کا عزم کر رکھا ہے۔ اسی عزم کے تحت ہم سیاسی اور تعلیمی میدانوں میں بڑے خلوص کے ساتھ کام کریں گے۔ کیونکہ ان پر حکومت کو اجارہ داری حاصل نہیں ہے۔ ہم مزدوروں، فوجیوں اور طلبا میں اپنے ہی خواہ اور حامی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم اس اضطراب کو ختم کرنے اور اُس ذہنی انتشار کو مٹانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں جسے بدقسمتی سے اشتراکیت نے جنم دیا ہے۔ ہم لوگوں پر یہ حقیقت واضح کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اشتراکیت

صرف الحاد و زندقے کا فتنہ پارینہ نہیں بلکہ جدید استعماریت ہے۔ یہ ایک عیارانہ چال ہے جس میں سادہ لوح فوراً گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ نظام ذہنوں کے اندر کبریائی، شخصی تفاخر، انانیت اور اکھاڑ پچھاڑ کے احساسات پیدا کرتا ہے۔ بائیں بازو کے انقلابیوں نے ایک ایسے خطرناک گروہ کو تیار کیا ہے جو عبادت گاہوں کے لیے کوئی احترام نہیں رکھتا۔ وہ شفقت اور محبت کے لطیف احساسات سے یکسر عاری ہے۔ وہ اپنی مقصد براری کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ بلا تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس کے پروگراموں میں کوئی معقولیت نہیں ہوتی۔ موجودہ فکری انتشار اور پُرآشوب حالات، جن میں اس وقت عوام اور ملک گرفتار ہیں، یہ سب کچھ سوکارنو صاحب کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی ذمہ داری کسی دوسرے پر قطعاً عائد نہیں ہوتی ہم اصحاب اقتدار کو قومی اور ملی ورثے کے تحفظ کی دعوت دیتے ہیں۔ ہمیں صدر کے آمرانہ طرز عمل، نوکر شاہی کے تسلط اور اشتراکیوں کی چیرہ دستیوں سے شدید نفرت ہے۔"

(روزنامہ الحیاۃ۔ بیروت ۲۳ جولائی ۱۹۶۶ء)

یہ ہے اُس ذہنی انتشار اور فکری آویزش کی تصویر جو سکارنو کی اشتراکیت نواز پالیسی کی وجہ سے ملک میں پیدا ہوئی۔ مگر اُسے اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ اُسے تو محض اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے مقصود تھے۔ چنانچہ اُس نے ہر اُس شخص کو جیل میں ڈال دیا جس نے اُس کے طرزِ عمل پر تنقید کرنے کی جسارت کی اور مقرروں اور خطیبوں کو بتایا کہ جب بھی زبان کھلے تو صرف اس نجات دہندہ کی حمایت میں کھلے ورنہ بند رہے۔ قلم اگر اٹھیں تو سرکار عالی مدار کی مدح و توصیف میں ورنہ انہیں توڑ دیا جائے۔ جب سکارنو صاحب نے یہ محسوس کیا کہ عوامی اضطراب کی لہریں برابر بڑھتی جا رہی ہیں اور ساری پیش بندیوں اور پابندیوں کے باوجود کچھ لوگ اُن کے کانوں تک ناخوشگوار باتیں پہنچا کر اُن کے عیش کو برباد کرتے رہتے ہیں تو انہوں نے بیک جنبشِ قلم ۵ جولائی ۱۹۵۹ء کو ایک صدارتی فرمان کے ذریعے ملک کے نمائندہ قانون ساز اداروں کو توڑ دیا اور مختلف مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل کر کے ایک نئے انقلاب کا نعرہ لگایا جسے وہ "ہدایت یافتہ جمہوریت" GUIDED DEMOCRACY

جمہوریت" کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ اس جمہوریت کی حیثیت محض ایک ڈھونگ کی سی تھی جس کے پیچھے صرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا، یہ کہ سوکارنو ملک کے سارے سیاہ وسپید کا مالک بن جائے اور کسی شخص کو اُس کے کسی قول اور فعل کے بارے میں بازپُرس کرنے کا حق باقی نہ ہو۔ اس نئی جمہوریت نے ملک کے سارے اختیارات اور اس کے سارے وسائل بلاشرکت غیرے اس ایک فرد کے سپرد کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی نشر واشاعت کی پوری مشینری حرکت میں آئی اور اُس نے عوام کے ذہنوں میں اس باطل خیال کی آبیاری کرنا شروع کی کہ ملک کی فلاح وبہبود کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ملکی مسائل کے حل کے لیے صرف "باپو" پر انحصار کیا جائے اور وہ جو کہے اور جو کرے اس کو مشیتِ ایزدی سمجھ کر بلاچون و چرا قبول کر لیا جائے۔ جن لوگوں نے سکارنو کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا انہیں میدان سے ہٹا دیا گیا۔ اس جرم کی سزا پانے والوں میں تحریکِ آزادی کی ایک نہایت قابلِ احترام شخصیت ڈاکٹر محمد حتّٰی بھی تھے جو ملک میں سوکارنو کے بعد دوسرے درجے پر سمجھے جاتے تھے۔

ملک کی ساری قوت وطاقت باپو کے ہاتھ میں پوری طرح منتقل ہو چکی تھی اور باپو کو اشتراکیت کے فرزندانِ ارجمند اچھی طرح شیشے میں اُتار چکے تھے، اس لیے باپو نے بڑے دھڑلے سے، ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر من مانی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ یہ شخص خود پسندی کے نفسیاتی مرض میں بہت بُری طرح مبتلا تھا اور کمیونسٹ اُس کی اس کمزوری کو بھانپ کر اس سے بے پناہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ باپو نے اپنی ذات کے گرد شہرت اور ناموری کا ہالہ بنانے کے لیے ایسے کام شروع کیے جن سے ہر روز اخبارات اور پریس میں اُس کے متعلق بڑی حیرت انگیز اور دلنواز خبریں شائع ہو سکیں۔ زرمبادلہ اور غیر ملکی امداد کو اگر معدنی اور زرعی پیداوار مثلاً ربڑ، تیل، لوہے، تانبے اور رکانی کی ترقی میں صرف کیا جاتا تو یہ کام ایک لمبے منصوبے کے تحت سرانجام پاتا اور اس سے اخبارات کے لیے دفعتاً کوئی بہت خوش کُن خبر نہ بن سکتی تھی۔ اس لیے قومی دولت غیر پیداآور مگر ہنگامہ خیز کاموں پر بے دریغ صرف کی جانے لگی۔ ان کاموں میں سرِفہرست بلند و بالا عمارات کی تعمیر ہے۔ چنانچہ گینفو سپورٹس کلب کی تعمیر پر کم و بیش

دس کروڑ ڈالر پانی کی طرح بہا دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ نشستوں پر مشتمل بنگ کارنو اسٹیڈیم تعمیر ہوا۔ جکارتہ کے ایک بڑے اور تمام سامان تعیش سے بھرپور ہوٹل پر دس کروڑ بیس لاکھ ڈالر صرف ہوئے۔ اسی طرح ۳۰ کروڑ ڈالر کے خرچ سے ایک مسجد اور ۳ لاکھ ڈالر سے ایک ۳۰۰ فٹ اونچا مخروطی شکل کا قومی عجائب گھر تعمیر ہوا۔ ان عمارات کے علاوہ بے شمار عمارتیں ابھی ایسی بھی ہیں جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ ان میں دنیا کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹ اسٹور، ایک وسیع و عریض پریس ہاؤس (جہاں سوکارنو کی طرف سے بلائی جانے والی افرو ایشیائی کانفرنس کے نمائندوں کو مفت ٹھہرنے کا انتظام کیا جا رہا تھا) اور طویل و عریض عمارتوں کی وہ قطاریں قابلِ ذکر ہیں جن میں ایمرجنسی فورس قیام کر سکتی تھی۔

قومی فضا میں تلاطم پیدا کرنے، عوام کو اپنی ذات کی طرف متوجہ رکھنے، انہیں اصل صورتِ حال پر غور و فکر کے مواقع سے محروم کرنے، اور نمائشی کاموں سے ان کا دل بہلانے کے لیے قومی بجٹ کا دو تہائی حصہ صرف ہو رہا تھا۔ ان میں ایک طرف ملائیشیا کے خلاف بے مقصد مہم تھی اور دوسری طرف عظمت کی یادگاروں کی تعمیر۔ غیر پیداآور کاموں پر اس طرح دولت لٹانے سے انڈونیشیا کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی۔ سونے کے ذخائر ختم ہو گئے اور زرِ مبادلہ نہ ہونے کی وجہ سے کارخانے بند کرنے پڑے۔ قرضوں کا بوجھ برق رفتاری کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور ملک روس اور امریکہ کے ہاتھوں میں قریب قریب رہن رکھا جا چکا تھا۔ قرضوں کی واپسی تو بڑی بات ہے عوام صرف سود کی ادائیگی کی بھی سکت نہ رکھتے تھے۔

جنگ اور عمارات کی تعمیر سکارنو کی شخصیت کو عارضی طور پر تابندہ بنانے کے لیے خواہ کتنی غیر معمولی اہمیت رکھتی تھیں لیکن اس سے عوام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ جنگ کے لیے دوسرے ممالک سے اسلحہ درآمد کرنا پڑا اور اس طرح ملکی دولت ان کے پاس چلی گئی۔ اتنی بڑی عمارات کو غیر ملکی کمپنیوں کے تعاون اور نگرانی کے بغیر تعمیر کرنا ناممکن تھا۔ اس لیے اس میدان میں بھی دولت اُن کی طرف منتقل ہونے لگی اور عوام بڑی تیزی کے ساتھ افلاس اور غربت کا شکار ہوئے۔ جب ملک میں سرمایہ کاری

کی رفتار سُست ہوئی تو بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوُا اور لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹنے لگے لیکن باپو کو سوائے اپنی شاہ خرچیوں اور عیش پرستیوں کے اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ ملک کا ہر فرد بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ملک تباہ ہو رہا ہے مگر کمیونسٹوں اور کاسہ لیسوں اور خوشامدیوں کی فوج سکارنو کو برابر یہ یقین دلا رہی تھی کہ بربادی اور تباہی کے افسانے آپ کے دشمنوں نے آپ کے خلاف گھڑے ہیں اس لیے ان دشمنوں کی خبر لینی چاہیے۔ حضور کا اقبال تو بڑی تیزی کے ساتھ بلند ہو رہا ہے۔

ان کاسہ لیسوں کی فوج میں تاجروں اور صنعت کاروں کے نئے طبقے نے بھی اضافہ کیا۔ چونکہ ملکی تجارت و صنعت پر حکومت کا پورا کنٹرول تھا اس لیے جو لوگ حکومت کے ساتھ تعاون اور اُس کی جا و بے جا حمایت کرنے پر آمادہ تھے انہیں دولت سے ہاتھ رنگنے کے بے پناہ مواقع میسّر آنے لگے۔ لائسنسوں، پرمٹوں اور درآمدی اور برآمدی سہولتوں کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے یہ لوگ لاکھوں اور کروڑوں کے مالک بن گئے۔ یہ حضرات حکومت کے بڑے مدح خواں تھے لیکن چونکہ اصل صورت بھی جانتے تھے اس لیے انہوں نے اندھا دھند کمائی ہوئی دولت کو سرمایہ کاری کے لیے وقف کرنے کے بجائے اپنی عیش پرستیوں پر صرف کرنا شروع کیا۔ اس سے ایک طرف تو ملک میں گرانی بڑھی اور دوسری طرف پیروزگاری میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوُا۔ اس صورتِ حال نے ملک کے اندر اخلاقی بے راہ روی کا طوفان اٹھا دیا اور ملک خود بخود انتشار کیت کی خطرناک راہ پر بڑھتا چلا گیا۔ انتشار کیت کے لیے ایسے حالات سے زیادہ سازگار حالات اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے کمیونسٹ خوب سوچ سمجھ کر ملک کو اس راہ پر ہانکے لیے جا رہے تھے۔

ان حالات میں سکارنو صاحب اوّل تو نصیحت کی کوئی بات سننے پر آمادہ ہی نہ تھے۔ اور اگر وہ آمادہ ہوتے بھی تو نصیحت اور خیر خواہی کی بات کرنے والوں کے بارے میں اُن کے کاسہ لیس اور کمیونسٹ، دونوں ان کو یہ تاثر دیتے تھے کہ حضورؐ یہ خود غرض لوگ آپ کی شہرت اور نامودی کے حاسد ہیں اور آپ جیسے "عظیم باپ" کو تخت و تاج سے محروم کر کے خود ان پر قبضہ کرنا چاہتے

ہیں۔ اس لیے ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا چاہیے۔

جب کوئی قوم کسی حیات آفریں تصورِ حیات سے محروم ہو کر، ذہنی خلا میں زندہ ہو، جب اُس میں اخلاقی بے راہ روی زور پکڑ رہی ہو، جب اُس میں رشوت ستانی اور اقربا نوازی کا دَور دورہ ہو، جب فاسد نظامِ معیشت کی وجہ سے ملک میں گرانی، افلاس اور بے روزگاری کا زور ہو اور عوام جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنا بھی ایک عذاب سمجھ رہے ہوں، جب اُن کے اندر محرومی اور بے بسی کا احساس ہونے کی وجہ سے یاس و قنوطیت اور بد دلی پیدا ہو جائے اور وہ اپنے مصائب پر فریاد کرنے کا حق بھی نہ رکھتے ہوں اور حکمران طبقے کوئی صحیح اور تعمیری طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے صرف اپنی تعریف و توصیف سننا پسند کریں، تو یہ حالات اشتراکیت کی توسیع و ترقی کے لیے روز بروز زیادہ سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی کی قوت ان حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھنی شروع ہوئی اور چونکہ سوکارنو کی پوری حمایت و سرپرستی اس کو حاصل تھی، اس لیے وہ بے روک ٹوک پھیلتی چلی گئی۔ ۱۹۶۵ء میں اس پارٹی کے ارکان کی تعداد ساڑھے تین لاکھ تک پہنچ گئی اور دو کروڑ سے اُوپر ہمدردان کے علاوہ تھے۔ سُرخ بلاک کے باہر اب یہ سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور جماعت بن چکی تھی۔ چین کے ممتاز تاجر، جو حکومت کی ناجائز مراعات کی وجہ سے بے حد امیر بن چکے تھے، اسے بے تحاشا مالی امداد فراہم کر رہے تھے۔ بہت سے سرکاری محکموں اور بنکوں پر اشتراکیوں اور اشتراکیت نوازوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پھر اس پارٹی نے فوج میں بھی اچھا خاصا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ ہوائی فوج کا سربراہ عمر دانی کمیونسٹ پارٹی کا علانیہ بہی خواہ تھا۔ ملک کا وزیر برنارجہ ڈاکٹر سوبانڈریو تو بغیر کسی اخفا کے کمیونسٹوں سے براہِ راست تعلق رکھتا تھا۔ بری فوج کے قریب قریب ایک چوتھائی حصے میں اشتراکی جراثیم پوری طرح سرایت کر چکے تھے۔ ملک کے اندر منصوبہ بندی کے مختلف اداروں اور داخلی اور خارجی پالیسی ترتیب دینے والے محکموں پر کمیونسٹ پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ پریس اور نشر و اشاعت کے دوسرے مراکز اشتراکیوں کی تحویل میں آ چکے تھے اور خفیہ پولیس پر

تسلط کی وجہ سے اشتراکی رہنما ملک کی ساری سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھ سکتے تھے۔

حالات کو اپنے موافق پاکر کمیونسٹ پارٹی نے ابتداءً یہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۷۰ء میں انڈونیشیا کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ لیکن صورت حال جس تیزی کے ساتھ اشتراکیت کے حق میں بدل رہی تھی اُس نے ان کو یہ کام بڑی عجلت کے ساتھ سرانجام دینے کی ترغیب دی اور یہ طے پایا کہ یہ انقلاب یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ہی لے آنا چاہیے کیونکہ ملک پکے پھل کی طرح اشتراکیت کی گود میں آگرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔ چنانچہ اس کے لیے متعدد انتظامات کیے گئے۔ صدر سکارنو کے حفاظتی دستے کی کمان کرنل انتونگ کے سپرد ہوئی تاکہ اگر آخر وقت میں وہ کوئی مزاحمت کرے تو اُسے کچل دیا جائے۔ کمیونسٹ نوجوانوں اور عورتوں کی تنظیموں کے ارکان کو جمع کرکے انہیں فضائیہ کے فوجی اڈے علیم سے ملحقہ علاقہ لوبانگ بادجہ میں لے آیا گیا اور ظاہر یہ کیا گیا کہ انہیں ملائشیا پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ اشتراکی لیڈروں نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کرکے پارٹی کے ارکان کو خبردار کیا اور کسان محاذ کے کارکنوں کو فصلیں تباہ کرنے، چاول و شکر کے ذخائر پر حملہ کرکے انتشار اور دہشت پھیلانے، مزدوروں کی ہڑتالیں کرا کے معاشی زندگی کو درہم برہم کرنے کی ہدایات جاری کی گئیں، جن جن بااثر لوگوں سے مخالفت کا خطرہ تھا انہیں اغوا اور قتل کرنے اور اُن کے مکانوں کو آگ لگانے کا ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ اور ایک ایسا دہشت پسند گروہ منظم کیا گیا جو قانون کو توڑ کر ملک میں فوراً انارکی پھیلا دے۔ پھر خوبصورت مغنیاؤں کا ایک دستہ بنایا گیا جو اپنے حسن سے متاثر کرکے دوسری جماعتوں کے رہنماؤں کو اشتراکی حلقۂ اثر میں لے آئے۔

اِدھر یہ تیاریاں ہو رہی تھیں اور اُدھر "باپو" اپنے محل میں دادِ عیش دے رہے تھے۔ انقلاب سے چند گھنٹے پیشتر تک انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ملک پر کونسی آفت ٹوٹنے والی ہے، اس لیے

کمیونسٹ پارٹی نے اپنے پروگرام اور منصوبے کے تحت راتوں رات ہر وہ قدم اٹھایا جو انقلاب کے لیے درکار تھا۔ فضائیہ کے اشتراکی عناصر نے ریڈیو جکارتہ پر قبضہ کر لیا۔ چھاتہ بردار فوج کی دو بٹالینوں نے صدارتی محل کو گھیرے میں لے لیا۔ ذرائع مواصلات مزدوروں کے قبضے میں آگئے اور ۴۵ افراد پر مشتمل ایک انقلابی کونسل نے حکومت کا پورا چارج سنبھال لیا۔ فوج کے جن جن جنرلوں سے مخالفت کا خطرہ تھا انہیں یا تو اُن کی جائے رہائش پر گولی مار دی گئی یا کسی دوسرے مقام پر لے جا کر انتہائی وحشیانہ طریقہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو جنرل جو واجب القتل لوگوں میں سرفہرست تھے بالکل معجزانہ طور پر بچ گئے۔ ایک ناسوشیوں اور دوسرے سہارتو انقلاب کی خبر سنتے ہی انہوں نے فوراً فوج کے وفادار عناصر کو اکٹھا کر لیا اور پھر عوام کے تعاون سے انقلابیوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس کے بعد بلا تاخیر فوج کے کمیونسٹ عناصر کا صفایا کر دیا گیا، اشتراکیت کے حامی ۱۲ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بند کر دیا گیا اور تمام اشتراکی جرائد اور اخبارات کی اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی۔

عوام کو جب اِس شرمناک کھیل کا پتہ چلا اور انہیں اپنے بہترین فوجی جنرلوں کی اذیت ناک موت کی اطلاعات ملیں تو اُن کے سالوں سے گھٹے ہوئے جذبات طوفان کی صورت میں بہ نکلے اور انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے اڈوں اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ یہ قتلِ عام کتنا وحشتناک تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف جزیرۂ بالی میں پچاس ہزار سے اوپر افراد ہلاک ہوئے۔ عوام اپنے جنرلوں کے بہیمانہ قتل اور کسان فرنٹ کی دہشت گردیوں کو یاد کر کر کے سخت مشتعل ہو رہے تھے۔ انہیں رہ رہ کر یہ بات یاد آتی تھی کہ کس طرح یہ لوگ اپنے دورِ اقتدار میں اُن کے گھروں پر حملے کرتے، اُن کی بہو بیٹیوں کی عصمت لوٹتے اُن کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالتے، ان کے مذہب پسند طبقوں پر ظلم و ستم ڈھاتے، مساجد اور کلام اللہ کی بے حرمتی کرتے اور اُن کے اخلاق کو برباد کرنے کے لیے شرمناک حربے استعمال کرتے

تھے۔ یوتھ فرنٹ کے ہیڈ کوارٹر پر جن بھیانک جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا اُن کا حال بھی اب عوام کو معلوم ہو گیا تھا۔ پھر جب اُن پر یہ راز افشا ہوا کہ اس ناکام انقلاب کا رابطہ پکنگ سے ہے تو اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ غیظ و غضب میں آکر چینی حکام اور چینی باشندوں پر بھی پل پڑے اس خفیہ تعلق کا سب سے بڑا ثبوت اُس چینی اسلحہ بارود کی دستیابی تھی جو سرگرم کمیونسٹوں کے قبضے سے برآمد ہوا اور جو تعمیراتی سامان کے لیبلوں کے ساتھ انڈونیشیا میں سمگل ہوا تھا۔ پھر ریڈیو پکنگ نے جو روش اختیار کی اُس نے بھی عوام کے اندر مزید ہیجان اور اشتعال پیدا کیا اور انہوں نے اشتراکیت کا سرزمین انڈونیشیا سے بالکل صفایا کر دینے کا تہیہ کر لیا

سوکارنو نے اس موقع پر بھی اشتراکیت کی حمایت جاری رکھی اور لوگوں کی توجہ اُس طرف سے ہٹانے کے لیے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ صرف وہی اُن کے سارے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے اس لیے انہیں اُس کی ذات پر پورا اعتماد اور بھروسہ کرنا چاہیے۔ مگر لوگوں کے سامنے اب تلخ حقائق اتنے کھل کر آچکے تھے کہ اُس شخص کی چرب زبانی سے وہ قطعاً متاثر نہ ہوئے اور انہوں نے اُس کی کسی بات پر بھی توجہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں یہ یقین ہو چکا تھا کہ خود "باپو" اس انقلاب میں ملوث ہے۔ اشتراکیت کے مقابلے میں طلبہ کے اندر ایک نئی تنظیم "کامی" حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اُبھری اور اُس نے دیکھتے دیکھتے نوجوانوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ یہ لوگ کمیونسٹ اثرات کو زندگی کے ہر شعبے سے زائل کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ انہوں نے صدر کے طرزِ عمل پر سخت گرفت کی اور اُس کے خلاف مظاہروں میں اس کی ایسی تصاویر دکھائی گئیں جن سے اُس کے قول و فعل کا تضاد نمایاں ہوتا تھا۔ یہ شخص خود تو اپنا سارا وقت عیش و عشرت میں بسر کرتا مگر عوام جب بھوک کا گلہ کرتے تو انہیں یہ نصیحت کرتا کہ ہمیں قومی وقار کے مقابلے میں پیٹ کو سامنے نہ لانا چاہیے، انسان صرف

روٹی پر زندہ نہیں رہتا۔

انڈونیشیا کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے متعلق ابھی کوئی چیز بھی وثوق اور یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن جو کچھ وہاں ہوا ہے اُس سے چند حقائق کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان ممالک کی قیادت اور سربراہی جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ فہم و تدبر کے اعتبار سے تہی دست اور خاص طور پر اپنی قوم کے مزاج کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ جب تک اس معاملے میں اخلاص اور ذہانت کا ثبوت نہ دیں گے اس وقت تک اس ملّت کا مستقبل تاریک رہے گا۔ محض قوت کے بل بوتے پر اس قوم کو کسی باطل نظریۂ حیات کا علمبردار بنا دینا سخت مشکل اور اس کی کوشش کرنا پرلے درجے کی حماقت اور بے وقوفی ہے۔ جس قدر جلدی مسلمان قوموں کے سربراہوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو جائے اُتنا ہی وہ ان کی غریب قوم اور خود اُن کے اپنے حق میں بہتر ہوگا۔

دوسرے، مسلم ممالک کے جو سربراہ اپنے عمل کی کمی کو محض زبان کے جوہر دکھانے اور صرف بلند بانگ دعووں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں بھی یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ زندگی بڑے ٹھوس حقائق سے عبارت ہے۔ کسی قوم کو جھوٹے طلسمات میں زیادہ دیر تک گرفتار نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے عوامی زندگی تلخ ہو گئی ہو تو وہ تلخیاں یقیناً ایک دن اُس کے طرزِ عمل میں جھلک کر سامنے آئیں گی۔

تیسرے، جبر و استبداد اور ذرائع اظہارِ رائے پر کنٹرول، عوام کی زبانیں بند کرنے کے لیے وقتی طور پر خواہ کتنا ہی مؤثر ہتھیار ہو مگر یہ تعمیر و ترقی کے لیے کبھی بھی مؤثر اور کارگر حربہ ثابت نہیں ہوا۔ اس سے کچھ دیر تک انسان تلخ اور ناخوشگوار باتیں سننے سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر اس سے عوامی زندگی میں کوئی سکون اور اطمینان پیدا نہیں ہوتا جو کسی برسرِ اقتدار شخص کی شہرت، ناموری اور پائیدار محبت کی ضمانت ہو۔ حقیقی عظمت مفاد پرستوں اور کاسہ

لیسوں یا تنخواہ دار ملازموں کے خوشامدانہ بیانات یا قصیدوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس ٹھوس اور مفید کام سے حاصل ہوتی ہے جس کی افادیت کو عوام دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں۔